۱۱

عرشِ الٰہی کو ہلا دینے والی دعائیں

(فرمودہ ۱۶؍اپریل ۱۹۳۷ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

میں نے گزشتہ جمعہ اور اس سے پہلے جمعہ میں دوستوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ وہ تحریک جدید کے مطالبات کو پورا کرنے کی کوشش کریں اور اس کے علاوہ اکتوبر تک ہر مہینہ میں دو دو روزے بھی رکھیں یہاں تک کہ گزشتہ دو سالوں کے برابر ہمارے چودہ روزے ہو جائیں۔ ایک ہر مہینہ کے پہلے پیر کو اور دوسرا ہر مہینہ کی آخری جمعرات کو۔ اور یہ کہ اگر کسی شخص سے اس پیر کا جمعرات کا روزہ رہ جائے تو وہ اسی مہینہ کے کسی دوسرے پیر یا کسی دوسری جمعرات کو روزہ رکھ لے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کسی اور دن کے روزہ سے ان روزوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔

اس کے علاوہ میں نے یہ بات بھی کہی تھی کہ مئی کے آخری ہفتہ کے اتوار کو ہر جماعت اپنے اپنے مقام پر جلسے منعقد کرے اور ان جلسوں میں تحریک جدید کے مطالبات کی طرف جماعت کے دوستوں کو توجہ دلائی جائے۔

بظاہر عقلمند کہلانے والے لوگوں کی نگاہ میں ان مطالبات میں سے میرا ایک مطالبہ شاید بالکل بے معنی اور توہّم پرستی کا اظہار سمجھا جائے۔ کیونکہ اِس مادیت کے زمانہ میں دُعا کرنا اور پھر دعا سے کسی

نتیجہ کی امید رکھنا نہایت بیوقوفی اور حماقت خیال کیا جاتا ہے۔ اور بہت سے لوگ جو دعاؤں کے قائل ہیں اور دعائیں کرتے ہیں وہ بھی درحقیقت دعا کو ایک تمسخر سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتے اور ان میں سے ننانوے فیصدی بلکہ ہزار میں سے ۹۹۹ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ اُن کی دعائیں ایک توہم، ایک تخیل، ایک تمسخر، ایک تک بندی اور اندھیرے میں تیر چلانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہزارہا دعائیں کرنے والے یا دوسروں کو اپنے لئے دعاؤں کی تحریک کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے ماں باپ یا دوسرے عزیز و اقارب سے دعا کا ذکر سنا ہؤا ہوتا ہے اور اس لحاظ سے وہ دوسروں کو دعا کیلئے کہنا سوسائٹی کا ایک فیشن سمجھتے ہیں۔ اور جونہی کسی دسرے سے ملتے ہیں بغیر دعا کی حقیقت کو سمجھنے کے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لئے بھی دعا کیجئے۔ ہزاروں آدمی احمدیوں، غیر احمدیوں بلکہ ہندوؤں اور سکھوں میں سے بھی جب مجھے ملتے ہیں تو جاتے ہوئے بے ساختہ کہہ دیتے ہیں ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے مگر جب وہ یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے تو میرا نفس محسوس کرتا ہے کہ ان کا دل دعاؤں کی عظمت سے واقف نہیں۔ وہ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے۔ مگر ان کا دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ یہ محض ان کو خوش کرنے کیلئے ہم کہہ رہے ہیں ورنہ دعا کوئی چیز نہیں اور نہ اسے کسی قسم کی اہمیت حاصل ہے۔ ہزاروں ہیں جو رسماً اسلام کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے یا رسماً ہندو مذہب کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے یا رسماً سکھ مذہب کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے دعائیں کرتے ہیں۔ کبھی ہاتھ اُٹھا کر، کبھی سر جُھکا کر، کبھی کھڑے ہو کر، کبھی بیٹھ کر، کبھی آگ کے آگے ہاتھ پھیلا کر، کبھی سمندر کی طرف منہ کر کے اور کبھی سورج کی طرف آنکھیں اٹھا کر۔ مگر جب دعا کے الفاظ اُن کی زبان پر جاری ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک عبادت ہے جو ہم بجالا رہے ہیں۔ ایک فرض ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ اس کے نتیجہ میں ہمیں کچھ نہ کچھ مل جائے گا لیکن انہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ دعا کی کیا حقیقت ہے اور دعا زمین و آسمان میں تغیر پیدا کرنے میں کس قدر عظیم الشان اثر رکھتی ہے۔ پس دنیا میں دعا کرنے والے بہت مل جائیں گے مگر دعاؤں پر یقین رکھنے والے اور دعاؤں کی حقیقت سمجھنے والے بہت ہی کم لوگ ملیں گے۔

پھر وہ لوگ جو دعا پر یقین رکھتے ہیں ان میں بھی سنجیدہ طبقہ بہت کم نظر آتا ہے اور ان قلیل لوگوں میں سے کثیر حصہ ایسا ہوتا ہے جو دعا خدا تعالیٰ سے ٹھیکہ کے طور پر کرتا ہے۔ مجھے چونکہ سینکڑوں نہیں

ہزاروں لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، ان لوگوں سے بھی جو دعائیں کرتے ہیں اور ان لوگوں سے بھی جو دوسروں کو اپنے لئے دعا کی تحریک کرتے ہیں اس لئے میں اپنے تجربہ کی بناء پر جانتا ہوں کہ ان میں سے اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں جو دعا خدا تعالیٰ کا امتحان لینے اور یہ دیکھنے کیلئے کرتے ہیں کہ آیا خدا ہماری بات سنتا ہے یا نہیں سنتا۔ پس گو وہ ظاہراً دعاؤں پر یقین رکھتے ہیں مگر ان کا یقین کسی یقین کی بنیاد پر نہیں بلکہ شک پر ہوتا ہے۔ جاؤ اور اپنے ہمسایوں اور اپنے دوستوں اور اپنے رشتہ داروں اور اپنے اِردگرد رہنے والے لوگوں سے پوچھ دیکھو کہ کیا آپ دعائیں کرتے ہیں؟ وہ یہی کہیں گے کہ بہت کیں بہت ہی کیں مگر آخر معلوم ہوا کہ خدا ہی کوئی نہیں جو دعائیں سنتا ہو یا کہیں گے کہ خدا بھی کوئی دعا نہیں سنتا۔ حالانکہ دعا کے معنے اس کامل تعلق، اس کامل محبت اور اُس کامل اخلاص کے ہیں جو بندہ کو خدا تعالیٰ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر جب دعا اُس تعلق کا نام ہے جو بندہ کا اپنے رب سے ہوتا ہے تو کوئی شخص کس طرح کہہ سکتا ہے میں نے دعائیں کیں مگر ان کا کوئی فائدہ نہ دیکھا۔ کیا تم نے کبھی کسی آنکھوں والے انسان کو دیکھا ہے کہ وہ کہتا ہو میں نے سورج کو دیکھا، بہت دیکھا اور بہت ہی دیکھا مگر آخر معلوم ہوا کہ سورج میں بھی روشنی نہیں۔ کیا تم نے کسی عورت سے سُنا کہ وہ کہتی ہو میں نے آگیں جلائیں، بہت جلائیں اور بہت ہی جلائیں مگر آخر معلوم ہوا کہ آگ میں بھی گرمی نہیں۔ کیا تم نے کسی پیاسے کے منہ سے کبھی یہ کلمات سُنے ہیں کہ میں نے پانی پیا، بہت پیا اور بہت ہی پیا مگر آخر معلوم ہوا کہ پانی بھی پیاس نہیں بجھاتا۔ تم کیوں یہ فقرے لوگوں کی زبان سے نہیں سنتے۔ اِس لئے کہ جس شخص نے پانی کا تجربہ کیا وہ پانی کا انکار نہیں کر سکتا۔ جس نے سورج کو دیکھا وہ سورج کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور جس نے آگ کو جلتے دیکھا وہ اُس کی گرمی کا انکار نہیں کر سکتا۔ پھر اگر دعا نام ہے اُس مقام کا جس مقام پر کھڑے ہو کر خدا تعالیٰ سے انسان کا انتہائی تعلق پیدا ہو جاتا ہے تو کیا اِس سے زیادہ احمقانہ بات بھی کوئی ہوگی کہ کہا جائے میں نے دعائیں کیں، بہت کیں اور بہت ہی کیں مگر آخر معلوم ہوا کہ کوئی خدا نہیں جو دعائیں سُنے۔ کیا ان الفاظ کا مفہوم اگر سیدھی سادی عبارت میں بیان کیا جائے تو یہ نہیں ہوگا کہ ہم نے خدا سے دوستی کی، دوستی کی اور بہت ہی کی مگر آخر معلوم ہوا کہ خدا کوئی نہیں۔ اگر اُس نے دعا سے قبل خدا تعالیٰ کو پا لیا تھا جس کو دیکھتے ہوئے اُس نے اُس سے دوستی کی تھی اور اُس سے دعائیں کیں تو دعا کے قبول ہونے یا نہ ہونے سے اُسے اُس کے وجود میں شک کیونکر پیدا ہو گیا۔ اور اگر اُس نے خدا تعالیٰ کو پایا ہی نہیں تھا تو وہ کس طرح کہہ سکتا ہے

میں نے خدا تعالیٰ سے دوستی کی، دوستی کی اور بہت ہی دوستی کی۔

تو دعا کا اصل مقام وہی ہے جب بندہ اپنے خدا کو پالیتا ہے کیونکہ دعا اسی صورت میں کی جاسکتی ہے جب بندہ کا اپنے خدا کی ہستی اور اس کی قدرتوں پر کامل یقین ہو۔ جب تم دنیا میں ایک معیّن اور مشخّص وجود کو آواز دیتے اور اسے اپنی طرف بُلاتے ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ تم اُسے جانتے اور پہچانتے ہو۔ لیکن اگر ایک شخص کو تم دیکھو کہ وہ کہہ رہا ہو اے زید! آؤ مجھ سے مصافحہ کرو اور میرے پاس بیٹھو اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ یہ کہے کہ زید تو دنیا میں ہے ہی نہیں تو تم ایسے شخص کو پاگل کہو گے یا نہیں؟ کیونکہ اگر زید دنیا میں تھا ہی نہیں تو اس نے کس طرح کہہ دیا تھا کہ آؤ زید مجھ سے مصافحہ کرو۔ تو وہ مقامِ تردّد جوار ہاص کا مقام کہلاتا ہے، جب انسان دعا کرتا ہے اور اُس کی دعا قبول کی جاتی ہے وہ اصل مقام نہیں بلکہ غیریت کا مقام ہے۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے اندھیرے میں سے گزرنے والا شخص کسی کو پکارتا اور کہتا ہے او بھائی! میری مدد کرو۔ اُسے اُس وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کوئی بھائی ہے بھی یا نہیں۔ بلکہ وہ صرف اس لئے بھائی بھائی کہہ رہا ہوتا ہے کہ شاید کوئی بھائی ہو اور وہ مدد کیلئے آجائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کبھی تو کوئی شخص اُس کی آواز سُن رہا ہوتا ہے اور وہ آواز سُن کر اُس کے پاس پہنچ جاتا ہے اور کبھی وہ یونہی اندھیرے میں سے آواز دیتے گزر جاتا ہے۔ اسی طرح وہ شخص جو دعا کے مقام پر کھڑا نہیں وہ اگر کہتا ہے اے خدا میری مدد کر تو اُس کی اِس دعا کی وہی کیفیت ہے جو اندھیرے میں سے گزرنے والے شخص کی پکار کی ہوا کرتی ہے۔ اس کی دعا کے جواب میں بھی اگر خدا تعالیٰ کی مدد اُس کی مصلحت کے ماتحت آجاتی ہے تو کہہ دیتا ہے خدا تعالیٰ نے میری مدد کی اور بعض دفعہ یہ بھی نہیں کہتا بلکہ اتنا کہنا ہی کافی سمجھتا ہے کہ اتفاقِ حسنہ ایسا ہوا کہ میرا کام بن گیا۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ خدا تعالیٰ کی مصلحت کے ماتحت اُس کی مدد اس کو نہ پہنچے تو یہ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ ہم نے بہت دیکھ لیا، خدا کا وجود ہی کوئی نہیں۔ حالانکہ اس نے دیکھا ہی کیا تھا۔ اگر وہ دیکھ لیتا تو انکار کس طرح کرتا۔ دیکھنے والا تو کبھی انکار نہیں کیا کرتا۔ ہاں اندھیرے والا کہہ سکتا ہے کہ مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ لیکن اس صورت میں بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کوئی خدا نہیں بلکہ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اندھیرے میں رہا اور مجھے اس کی مدد نہ پہنچی۔ ایک باپ اگر اپنے بچے کی کسی ضرورت کو بعض دفعہ پورا نہیں کرتا تو کیا بچہ کہہ سکتا ہے کہ میرا باپ کوئی نہیں یا اگر تمہاری ماں تمہاری کسی ضرورت کو پورا نہ کرے تو تم کہہ سکتے ہو کہ ہماری ماں ہی کوئی نہیں۔ تم یہ تو

کہہ سکتے ہو کہ ہمارے باپ نے بھی ہماری خواہش پوری نہ کی، ہماری ماں نے بھی ہماری ضروریات کی طرف توجہ نہ کی مگر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا باپ اور ہماری ماں کوئی نہیں۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی دعا قبول نہ ہو تو وہ یہ تو کہہ سکتا ہے کہ آہ! میرے خدا نے بھی میری دعا نہ سنی۔ گو یہ بھی بے ادبی ہوگی، گو یہ بھی گستاخی ہوگی، گو یہ بھی بے دینی ہوگی، مگر یہ معقول بے دینی ہوگی۔ لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ میری دعا نہیں سُنی گئی اِس لئے کوئی خدا ہی نہیں۔ اگر ایک شخص کسی کو آواز دیتا اور بُلاتا ہے لیکن وہ کسی مصلحت کے ماتحت نہیں آتا تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس کو میں نے بُلایا تھا وہ ایک فرضی وجود تھا، حقیقت میں اِس کا کوئی وجود نہیں۔ اسی طرح اگر دعا کے بعد کسی کی مرضی کے مطابق نتیجہ نہیں نکلتا تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے بہت دیکھ لیا خدا کا بھی کوئی پتہ نہیں چلا۔ اگر اس نے خدا تعالیٰ کو دیکھ لیا تھا تو اُس کا انکار کس طرح کر سکتا ہے۔ اور اگر نہیں دیکھا تھا تو اس سے زیادہ جھوٹ اور کیا ہوگا کہ کہا جائے میں نے خدا کو دیکھا حالانکہ اس نے اسے نہیں دیکھا۔

تو جو لوگ دعائیں کرنے والے ہیں ان میں سے بھی ایک حصہ ایسا نکلے گا بلکہ ایک حصہ یقیناً ایسا ہے جو اندھیرے والی دعا کرتا اور اس کے بعد رؤیت والی دعا کا دعویٰ کرنے لگ جاتا ہے۔ گویا وہ اپنی نابینائی کو خدا کی طرف منسوب کرتے اور اس کی ہستی کا انکار کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کی مثال اس نابینا کی سی ہوتی ہے جس سے کسی شخص نے سورج کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگا سورج کی کیا دلیل ہے؟ اس نے کہا سورج کی دلیل روشنی ہے جس سے ہر چیز کا اصلی رنگ نظر آجاتا ہے، سفید چیز سفید نظر آتی ہے اور سیاہ چیز سیاہ۔ وہ نابینا کہنے لگا رنگوں کا فرق بھی تو بے دلیل بات ہے، دنیا میں کوئی رنگ نہیں۔ یہ بھی اپنی نابینائی کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی ہستی کا انکار کرتے اور اندھیرے میں ہو کر روشنی میں دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

پھر وہ جو دعاؤں پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اُن کو بھی اگر دیکھا جائے تو ان میں کمزوروں کا ایک گروہ نظر آتا ہے۔ یعنی خدا انہیں دے دے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں، نہ دے تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ گویا پہلا گروہ تو وہ تھا جس نے دعا کی اور اتفاق سے جو پہلی دعا اُس نے کی وہی قبول نہ ہوئی اور وہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا منکر ہو گیا۔ اور یہ وہ گروہ ہے جو دعائیں کرتا رہا اور خدا قبول کرتا رہا لیکن جونہی کوئی ایسی دعا آئی جسے خدا تعالیٰ نے اپنی مصلحت سے قبول نہ کیا تو یہ بھی کہنے لگ

گیا کہ ہم نے دیکھ لیا خدا سے دعائیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ حالانکہ ایسے لوگ اگر اپنے ارد گرد کے طبیبوں اور ڈاکٹروں کو دیکھیں تو انہیں نظر آ جائے کہ بڑے بڑے ڈاکٹر اور طبیب مریضوں کا علاج کرتے ہیں اور پھر علاج میں بُری طرح ناکام ہوتے ہیں مگر باوجود اس ناکامی کے لوگ پھر بھی ان کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں۔ وہ انہیں روپیہ بھی دیتے ہیں، ان سے دوائیں بھی لیتے ہیں۔ ان کے نخرے بھی برداشت کرتے ہیں اور کبھی انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ ہمارے دائیں بائیں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انہی ڈاکٹروں اور طبیبوں نے بعض مریضوں کا علاج کیا اور وہ یا تو مر گئے یا اُن کی بیماری طُول پکڑ گئی۔ غرض علاج میں انہیں کئی جگہ ناکام دیکھنے کے باوجود لوگ اُن سے علاج کرائیں گے۔ اُنہیں فیسیں دیں گے اور اُن کی طرف دوڑے چلے جائیں گے۔ لیکن دعا جس پر کچھ بھی مال خرچ نہیں ہوتا۔ وہ اگر قبول ہو جائے تو کہہ دیں گے خدا نے فضل کر دیا۔ لیکن اگر کوئی دعا قبول نہ ہو تو کہہ دیں گے بس جی دیکھ لیا، دعا کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ ایسے لوگ درحقیقت خدا تعالیٰ سے سَودا کرنیوالے ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کبھی سَودا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ بلکہ خدا تو الگ رہا خدا تعالیٰ کے بندے بھی دوسروں سے سَودا نہیں کرتے۔

میرے پاس ہر سال بیسیوں درخواستیں اچھے اچھے تعلیم یافتہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی آتی رہتی ہیں جن میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ میں بی۔اے ہوں، میں ایم۔اے ہوں، میں ای۔اے۔سی ہوں، میں فلاں معزز خاندان میں سے ہوں میرے دل پر اسلام کی حقیقت کُھل گئی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ احمدیت میں داخل ہو جاؤں لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہماری سوسائٹی میں احمدیت کی سخت مخالفت ہے پس اگر میں احمدی ہو جاؤں تو آپ میری کیا امداد کریں گے؟ میں ہمیشہ ایسے لوگوں کو یہ لکھوایا کرتا ہوں کہ مالی امداد دینے والے دنیا میں اور بہت سے ہیں۔ اگر تم پر اسلام کی سچائی کُھل گئی ہے تو اِس بارہ میں تمہیں مجھ سے مشورہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں تم اس سچائی کا اظہار کرو اور اس کے بدلہ میں کسی مادی فائدہ کی امید مت رکھو۔ کیا تم نے کبھی سُنا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہو میں نے فلاں لڑکی سے شادی کی تجویز کی ہے۔ وہ بہت نیک اور اچھے خاندان کی ہے اگر میں وہاں شادی کرلوں تو اے لوگو! تم مجھے کیا دو گے؟ کیا تم نے کبھی سنا کہ کوئی شخص سخت پیاس کی حالت میں میلوں میل چکر کاٹ کر ایک چشمہ کے پاس پہنچے اور وہاں یہ کہنا شروع کر دے کہ اے دوستو! بتاؤ اگر میں اس چشمہ سے اپنی تین دن کی پیاس بُجھا لوں تو تم

مجھے کیا دو گے؟ اگر ان چھوٹے چھوٹے فوائد کے حاصل ہونے پر بھی دنیا میں کوئی دوسرے سے ایسے بیہودہ سوال نہیں کرتا بلکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جانے کو ہی اپنی سب سے بڑی کامیابی قرار دیتا ہے تو خدا تعالیٰ کی ملاقات اور اُس کے وصال کا راستہ میسر آ جانے پر اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میں اس راستہ پر چلا تو مجھے کیا دو گے؟ تو وہ پاگل نہیں تو اور کون ہے۔

مذہب کے معنے تو اُس راستہ کے ہیں جو انسان کو خدا تعالیٰ تک پہنچا دے۔ پس اگر اس نے ایسا راستہ پالیا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس نے خدا کو پالیا۔ پھر جب اس نے خدا کو پالیا ہے تو اس کا یہ کہنا کہ مجھے کیا دو گے، بیوقوفی اور حماقت ہے۔ جو شخص کچھ پالیتا ہے اس سے لوگ لیا کرتے ہیں یا وہ لوگوں سے لیتا ہے۔ کیا تم نے کبھی سنا کہ کوئی طالب علم آئے اور کہے اے بھائیو! میں امتحان میں پاس ہو گیا ہوں اب بتاؤ تم مجھے کیا کھلاؤ گے؟ جو لڑکا امتحان میں کامیاب ہوتا ہے وہ دوسروں سے مانگا نہیں کرتا بلکہ اُستاد اور ہم سبق دونوں اُس کے پاس جاتے اور کہتے ہیں ہمیں مٹھائی کھلاؤ کیونکہ تم کامیاب ہوئے ہو۔

پس اگر یہ سچ ہے کہ انہوں نے سچا مذہب پالیا ہے تو پھر دنیا کا حق ہے کہ وہ ان سے قربانی کا مطالبہ کرے۔ ان کا حق نہیں کہ وہ لوگوں سے اپنے لئے مانگیں۔ دیکھو محمد ﷺ نے اپنے خدا کو پالیا۔ پھر انہوں نے لوگوں سے کچھ مانگا نہیں بلکہ دنیا کی بھلائی کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت نوح علیہم السلام نے خدا تعالیٰ کو پالیا پھر انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہمیں کیا دو گے بلکہ انہوں نے کہا ہم نے پالیا ہے آؤ ہم تم کو بھی دیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دور سے خدا تعالیٰ کا نور آگ کی شکل میں دیکھا تو انہوں نے یہی کہا کہ ٹھہرو میں وہاں جاتا ہوں اور وہاں سے کوئی انگارا تمہارے لئے بھی لاؤں گا۔ تو جو لوگ کچھ پالیتے ہیں وہ لوگوں سے یہ نہیں کہا کرتے کہ ہمیں کیا دو گے؟ بلکہ وہ کہتے ہیں ہم سے کیا قربانی لو گے۔ تو میں انہیں ہمیشہ یہ جواب دیا کرتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں کہ پھر وہ سب کے سب خاموش ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں حقیقت میں خدا نہیں ملا ہوتا بلکہ وہ دنیا کے بُھوکے ہوتے ہیں اور چونکہ وہ چیز جس کی انہیں تلاش ہوتی ہے میرے پاس نہیں ہوتی اِس لئے وہ مایوس ہو کر کسی اور طرف کا رُخ کر لیتے ہیں۔

تو جب خدا تعالیٰ کے بندے بھی سَودا کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت

پڑی ہے کہ وہ لوگوں سے سَودا کرتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی طبیعت کے لوگ گرتے چلے جاتے ہیں اور آخر دعا کے مقام پر وہی قائم رہتے ہیں جو اِس مقولہ پر عمل کرتے ہیں کہ ؎

جو منگے سو مر رہے مرے سو منگن جائے

یعنے مانگنا ایک قسم کی موت ہے لیکن اگر کوئی مانگنا ہی چاہے تو پھر وہ دروازہ سے ہِلے نہیں بلکہ بیٹھا رہے ، بیٹھا رہے اور بیٹھا رہے یہاں تک کہ مر جائے۔ بیشک دُنیوی لحاظ سے اِس کے یہ معنے بھی ہیں کہ بندوں سے مانگنا موت ہوتا ہے۔ لیکن روحانی لحاظ سے اس کے یہ معنی ہیں کہ دعا اُس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک انسان اپنے آپ پر ایک جسمانی موت وارد نہیں کر لیتا۔ وہ دعا کرتا ہے اور دعا میں اِس قدر محو ہو جاتا ہے اور اِتنے تضرع ، اِتنے درد ، اِتنے سوز ، اِتنے گریہ ، اِتنے قلق اور اِتنے اضطراب کے ساتھ دعا مانگتا ہے کہ وہ بُھول جاتا ہے اپنے ماحول کو ، وہ بُھول جاتا ہے اپنے گردو پیش رہنے والے لوگوں کو ، وہ بُھول جاتا ہے اپنے عزیزوں ، دوستوں رشتہ داروں کو ، وہ بُھول جاتا ہے اپنے بیوی بچوں کو اور وہ بُھول جاتا ہے اپنے آپ کو یہاں تک کہ سب کچھ بُھول کر وہ خدا کے پاس چلا جاتا اور اُس کے حضور اپنی حاجات پیش کرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ساری خیر خدا میں ہی ہے۔ تب جس طرح ایک پیاسا شدتِ پیاس سے دور سے چشمے کو دیکھ کر دَوڑ کر اُس کی طرف جاتا اور ضُعف و ناطاقتی کی وجہ سے چشمہ کے قریب جا کر گر جاتا اور نہایت حریص اور للچائی ہوئی نگاہوں سے چشمہ کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا ہے کہ کاش! چشمہ حرکت میں آئے اور اس کے منہ میں خود بخود اُس کا پانی پہنچ جائے اسی طرح دعا کرنے والے کی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ بھی بے حس ہو کر آستانہء الوہیت پر گر جاتا ہے اور اپنے رب کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ بے شک جسمانی چشمے ایسی حالتوں میں چل کر انسان کے پاس نہیں آتے مگر روحانی چشمے ایسی حالت میں خود بخود چل کر انسان کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ[1]۔ اے محمد ﷺ کوئی مانگنے والا ایسا بھی ہوگا جو دعائیں کرتا چلا جائے گا ، کرتا چلا جائے گا اور کرتا چلا جائے گا یہاں تک کہ اُس کے پیر تھک جائیں گے ، اُس کے ہاتھ شل ہو جائیں گے ، اُس کا دماغ پریشان ہو جائے گا ، اُس کے قویٰ مضمحل ہو جائیں گے اور وہ بے اختیار ہو کر کہے گا میرا خدا کہاں ہے؟ فرمایا اسے کہہ دو اِنِّیْ قَرِیْبٌ میں دوڑا ہی آ رہا ہوں۔ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ جب بندہ ایسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کو پکارتا چلا جاتا ہے جب

وہ تھک جاتا اور اُس کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں تو فرمایا ایسی حالت میں پھر وہ نہیں پکارتا بلکہ میں اُسے پکارنا شروع کر دیتا ہوں۔ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ اُسے چاہیئے کہ اب میری آواز کا جواب دے اور اُسے سُنے۔ گویا پہلے فقرہ میں تو یہ مضمون تھا کہ بندہ اللہ تعالیٰ کو بلاتا ہے اور اِس میں یہ بیان کیا کہ پھر خدا اپنے بندے کو بلاتا ہے اور جونہی اُس کی قوتیں رہ جاتی ہیں خدا خود دوڑ کر اُس کی طرف آتا اور اُس وقت وہ طالب اور بندہ مطلوب، خدا مُحبّ اور بندہ محبوب بن جاتا ہے۔ یہ دعا کا مقام ایسا بلند مقام ہے جو زمین اور آسمان کو ہِلا دیتا ہے۔ جہاں قبولیت اور عدمِ قبولیت کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ قبولیت ہوتی اور بہت ہوتی ہے مگر اس شخص کو اس کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی وہ صرف ایک ہی بات جانتا ہے اور وہ یہ کہ میرا کام یہ ہے کہ میں اپنے رب سے مانگتا رہوں۔

تم اگر سچی محبت کے انسانی نظائر پر ہی غور کرو تو تمہیں یہ مثال وہاں بھی نظر آ جائے گی۔ ہاں حقیقت کی آنکھیں کھول کر دیکھو پھر تمہیں چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی عظیم الشان سبق پنہاں نظر آئیں گے۔ تم نے بچہ کو اپنی ماں سے چمٹتے کئی دفعہ دیکھا ہوگا۔ تم دیکھتے ہو کہ بچہ کی باہیں اس کی ماں کے گلے میں ہوتی ہیں، اُس کا سینہ اپنی ماں کے سینہ سے لگا ہوتا ہے اور وہ اپنی ماں سے اتنا زیادہ قریب ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ قریب ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ کہتا جاتا ہے کہ اماں! اماں۔ وہ کیوں اماں! اماں! کہہ رہا ہوتا ہے حالانکہ وہ ماں کے پاس ہی ہوتا ہے۔ وہ اسی لئے باوجود قریب ہونے کے اماں! اماں! کہتا ہے کہ ماں کو پکارنا اب اُس کی غذا بن گیا ہے اور اسی پکار میں اُس کی تمام راحت ہوتی ہے۔ یہی حال ایک سچے سالک کا بھی ہوتا ہے۔

جس شخص کو خدا تعالیٰ سے حقیقی محبت ہوتی ہے وہ ضرورت کیلئے خدا تعالیٰ سے نہیں مانگتا بلکہ مانگنے کیلئے مانگتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر وقت خدا تعالیٰ کا سائل ہی بنا رہے۔ تم نے اپنے گھروں میں اور خود اپنی ذات میں اِس بات کا کئی دفعہ تجربہ کیا ہوگا کہ جب کوئی فقیر تمہارے دروازے پر آتا اور کہتا ہے مجھے کچھ خیرات دو تو تم اُسے کچھ دے دیتے ہو۔ اس کے بعد وہ چلا جاتا ہے اور تم اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہو۔ لیکن اگر وہ نہ جائے اور دروازہ پر کھڑا رہے تو تم اُسے کہتے ہو اَب جاتے کیوں نہیں میں نے تمہیں خیرات دے دی ہے۔ یہی روحانی خلش اور یہی روحانی خوف ایک خدا کے مُحبّ کے دل میں بھی ہر وقت رہتا ہے کہ اگر میری ایک ضرورت پوری ہوگئی اور دوسری دفعہ میں نے خدا تعالیٰ سے نہ

مانگا تو خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھے کہا جائے گا کہ اب کیوں کھڑے ہو، ہمارے دربار سے چلے جاؤ اور چونکہ اس کی اصل غرض مانگنا نہیں بلکہ اپنے محبوب کے دربار میں کھڑا رہنا ہوتی ہے اِس لئے وہ مانگتا ہے اور مانگتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اسے ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ کا سائل بنا رہے اور اسے یہ نہ کہا جائے کہ اب چلے جاؤ، تمہاری ضرورت پوری ہوگئی۔ پس ہر وقت ہی وہ کوئی نہ کوئی ضرورت پیش کرتا رہتا ہے تا ہر وقت اسے اللہ تعالیٰ کے دروازہ پر کھڑے رہنے کا حق حاصل رہے۔ یہ حقیقی محبت کا ایک نظارہ ہوتا ہے مگر لوگ اِس کو فلسفیانہ رنگ میں حل کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ایک جنس کو دوسری جنس سے ناپا نہیں جا سکتا۔ تم ہوا اور پانی کو اگر ترازو میں تولنا چاہو تو یہ تُل نہیں سکیں گے۔ اسی طرح عشق اور محبت کے جذبات کو تم فلسفہ کے ترازو میں نہیں تول سکتے اور اگر تولو گے تو یہ اس ترازو سے نکل بھاگیں گے۔ لیکن ہوا کو اگر ان آلات سے تولو جو سائنس نے گیسوں کے متعلق ایجاد کئے ہیں تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ان چیزوں کا بھی وزن ہے اور ان میں بھی طاقت اور قوت ہے حتیٰ کہ سائنس نے یہ دریافت کیا ہے کہ جب کسی چیز میں بالکل خلاء کر دیا جائے تو ہوا کا بیرونی دباؤ اُس چیز کو توڑ دیتا ہے۔ گویا جس چیز کو ہم خالی سمجھ رہے ہوتے ہیں وہ خالی نہیں ہوتی بلکہ اُس میں جو ہوا ہوتی ہے وہ ہمارے سامانوں کی حفاظت کر رہی ہوتی ہے لیکن ہماری ظاہری نظر اس کو خالی کہہ دیتی ہے۔

دُعا ایک ایسا حربہ ہے جس کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کرسکتی۔ اور دعا اظہارِ عشق کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ شاید تم میں سے وہ لوگ جو بڑی عمر کے ہیں وہ اپنے بچپن کی باتیں بُھول چکے ہوں لیکن مجھے تو ابھی تک بہت سی باتیں یاد ہیں۔ مجھے وہ نظارہ خوب یاد ہے جب ہم چھوٹے چھوٹے بچے ہوا کرتے تھے اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہتے تھے ''آؤ اماں اماں کریے۔ آؤ ابا ابا کریے'' (پنجابی)۔ اس کا مطلب کیا ہوتا تھا؟ شاید ایک فلسفی یہ نظارہ دیکھ کر کہے کہ بچے کیسے پاگل ہیں کہ ماں باپ کے پاس رہتے ہوئے اس قسم کے فقرے کہتے ہیں۔ مگر حقیقتاً وہ پاگل پن کا اظہار نہیں بلکہ اپنے بڑوں کو یہ نصیحت کرنا ہے کہ دیکھو ہمیں اپنی ماں سے محبت ہے اور ہم کہتے ہیں ''آؤ اماں اماں کریے''۔ ہمیں اپنے باپ سے محبت ہے اور ہم کہتے ہیں ''آؤ ابا ابا کریے''۔ پھر جبکہ تمہیں دعویٰ ہے کہ تم اپنے باپ اور اپنی ماں سے بہت زیادہ خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو کیا تمہارا فرض نہیں کہ تم اُس کو یاد کرو اور اُس کے اور زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرو۔ جس وقت ایک فلسفی اپنے سامنے میز لگائے کُرسی

پر بیٹھ کر نہایت ہی رعونت اور تکبر کے ساتھ یہ فقرے لکھتا ہے کہ کیسا ہی بیوقوفی کا وہ مذہب ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاؤ اور کہو اے اللہ! اے اللہ!۔ بھلا ان الفاظ کے دہرانے سے اس کا کیا فائدہ اور خدا کا کیا فائدہ؟ اُسی وقت اُس کی میز کے نیچے اُس کا بچہ اُسے بیوقوف بنا رہا اور اُس کی حماقت اُس پر ظاہر کر رہا ہوتا ہے۔ جب وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کہتا ہے ابا ابا۔ اس طرح وہ جاہل اپنے علم کے گھمنڈ میں اسی فلسفہ کو رڈ کر رہا ہوتا ہے جس فلسفہ کو اُس کا بچہ اپنے عمل سے ثابت کر رہا ہوتا ہے۔ مگر چونکہ محبت کا فلسفہ عقل کے فلسفہ سے بالکل جُدا ہے اس لئے فلسفی اِس راز سے آگاہ نہیں ہوتا۔

غرض جب میں نے کہا کہ آؤ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کریں تو میں نے ایک رسمی چیز تمہارے سامنے پیش نہیں کی بلکہ جب میں نے کہا کہ دعائیں کرو تو یہ جانتے ہوئے کہا کہ تم میں سے بہت ہیں جو عرشِ الٰہی کو ہِلا دینے والی دعائیں نہیں کرتے۔ اور یہ جانتے ہوئے کہا ہے کہ دعا کوئی معمولی چیز نہیں۔ پس میں نے رسماً نہیں کہا، میں نے عادتاً نہیں کہا مگر میں نے یہ بھی جانتے ہوئے کہا ہے کہ دعا کیلئے ہزار، دس ہزار یا ایک لاکھ آدمیوں کی ضرورت نہیں۔ اگر لاکھوں کی جماعت میں سے دس آدمی بھی ایسے نکل آئیں جن کے دل حقیقی دعا کرنے والے ہوں تو وہ زمین اور آسمان کو ہلانے کیلئے کافی ہیں۔

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ یتیم کی دعا عرش کو ہلا دیتی ہے[۲] اور رسول کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جماعت کی متحدہ دعا قبول کی جاتی ہے[۳]۔ پس جب میں نے کہا کہ آؤ ہم دعا کریں تو اس وقت یہ دونوں باتیں مجھے نظر آ رہی تھیں اور میں سمجھتا ہوں کہ میری مثال اُس شخص کی سی تھی جس کا دایاں بھی برکت والا ہو اور جس کا بایاں بھی برکت والا ہو۔ میں سمجھتا تھا اگر مجھے ایک جماعت مل گئی تو رسول کریم ﷺ کا یہ قول بھی پورا ہو جائے گا کہ جماعت کی متحدہ دعا قبول کی جاتی ہے اور اگر مجھے کوئی ساتھی نہ ملا اور میں اکیلا رہا تو رسول کریم ﷺ کے اس دوسرے قول کی سچائی ثابت ہو جائے گی کہ یتیم کی دعا عرش کو ہلا دیتی ہے۔ پس اگر مجھے جماعت حاصل ہوگئی تب بھی میرا مقصد پورا ہو گیا اور اگر میں اکیلا رہا تب بھی میرا مقصد مجھے حاصل ہو گیا کیونکہ رسول کریم ﷺ نے ان دونوں حالتوں میں قبولیت دعا کی بشارت دی ہوئی ہے۔ جماعت ہونے کی صورت میں بھی اور یتیم ہونے کی صورت میں بھی۔ اور یتیم سے صرف وہی مراد نہیں جس کے ماں باپ نہ ہوں بلکہ جو بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں اکیلا رہ جائے وہ یتیم ہے اور جو اپنے ساتھی پا لے وہ جماعت ہے۔ ہمارے خدا نے بھی قرآن مجید میں اس بات کا اظہار فرمایا ہے

چنانچہ ایک نبی کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ ''امۃ'' تھا[۴]۔ یعنی ایک جماعت اس کو حاصل تھی اور ایک دوسرے نبی کے متعلق فرمایا کہ وہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف بُلاتا تو سب منتشر ہو جاتے اور وہ نبی اکیلا رہ جاتا۔ گویا ایک نبی وہ تھا جس نے جماعت بن کر خدا تعالیٰ کی مدد حاصل کی اور دوسرا وہ تھا جس نے یتیم بن کر خدا تعالیٰ کی نصرت حاصل کی۔

یہ مت خیال کرو کہ تم اِس وقت امن کی حالت میں ہو اور تمہیں دشمن کی طرف سے کسی حملے کا خوف نہیں۔ اپنے آپ کو امن کی حالت میں کہنا اور دشمن کے حملہ سے بے خوف ہو جانا حماقت ہوتی ہے۔ کیونکہ بسا اوقات جب انسان یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ مصیبت ٹل گئی وہ پہلے سے بھی زیادہ مصیبت کا شکار ہو جاتا ہے۔ گزشتہ سال حبشہ اور اٹلی والوں کے درمیان جو جنگ ہوئی اور جس میں حبشہ نے شکست کھائی اس کے متعلق جن محققین نے اِس نقطہ نگاہ سے غور کیا ہے کہ حبشہ والے کیوں ہارے؟ حالانکہ ابتداء میں انہوں نے اٹلی کو خطرناک شکست دی تھی تو وہ اِسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حبشہ والے ہار گئے کیونکہ انہوں نے یہ خیال کیا کہ ہم جیت گئے ہیں۔ گویا جب انہوں نے شروع میں اٹلی کی فوجوں کو شکست دے دی تو وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی نے حبشہ کو غافل پا کر پھر حملہ کر دیا اور اُسے شکست دے دی۔

میں دیکھتا ہوں یہی حال اِس وقت ہماری جماعت کے افراد کا ہے۔ جب دشمن کا حملہ تھوڑی دیر کیلئے ہٹ جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں اب ہم بچ گئے۔ میں پوچھتا ہوں تم کیونکر سمجھتے ہو کہ اب ہم بچ گئے۔ کیا احرار سے ہمارا فیصلہ ہو گیا ہے یا کیا گورنمنٹ سے ہمارا تصفیہ ہو گیا ہے؟ اگر دشمن اس وقت خاموش ہو گیا ہے تو اُس کی خاموشی کے یہ معنے کس طرح ہو گئے کہ ہماری لڑائی ختم ہو گئی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ انتظار کر رہا ہو کہ تم سو جاؤ اور مطمئن ہو جاؤ تو پھر وہ تم پر حملہ کرے۔ پس جب تک ہماری گورنمنٹ سے باقاعدہ صلح نہیں ہو جاتی یا جب تک احرار سے ہمارا ایسا تصفیہ نہیں ہو جاتا جس کے بعد احرار کے لئے ہمارے مقابلہ میں سر اُٹھانا ناممکن ہو جائے، اُس وقت تک اگر ہماری جماعت میں سے ایک آدمی بھی خاموش ہو کر بیٹھ رہتا ہے تو اِس کے معنی سوائے اِس کے کچھ نہیں کہ وہ احمق اور بیوقوف ہے۔ یاد رکھو مومن کے دل پر جو زخم لگتے ہیں وہ کبھی مُندمل نہیں ہوتے اور اُس وقت تک ہرے رہتے ہیں جب تک دوسرے زخموں کے لگنے کا احتمال باقی رہتا ہے۔ حضرت نوحؑ کی لائی ہوئی تعلیم دنیا سے کیوں مٹ گئی؟ اِس لئے

کہ ان زخموں کی یاد تازہ رکھنے والے لوگ مٹ گئے۔ حضرت موسیٰ کی لائی ہوئی تعلیم دنیا سے کیوں مٹ گئی۔ اس لئے کہ موسیٰ کو جو زخم لگے ان کی یاد تازہ رکھنے والے لوگ دنیا میں نہ رہے۔ تم کیوں کہتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّین ہیں اور آپ کی لائی ہوئی تعلیم مٹ نہیں سکتی؟ اسی لئے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسے لوگ ہمیشہ آتے رہیں گے جو اِن زخموں کو کُریدتے رہیں گے۔ اگر اس اُمت میں بھی زخم کریدنے والے نہ آتے تو آپ کی لائی ہوئی تعلیم بھی مٹ جاتی کیونکہ تعلیم کبھی کتابوں کے ذریعہ قائم نہیں رہتی بلکہ ماننے والوں کے ذریعہ قائم رہتی ہے۔ پس جبکہ خدا نے اپنی مصلحتوں کے ماتحت ہمارے ہاتھوں اور ہمارے پاؤں کو باندھ رکھا ہے اور ہماری زبانوں کو اُس نے بند کیا ہوا ہے۔ جب ایک طرف وہ یہ کہتا ہے کہ جاؤ اور حکومتِ وقت کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو اور دوسری طرف یہ حکم دیتا ہے کہ گالیاں سنو اور چُپ رہو۔ سوائے ایسے خاص حالات کے جن میں وہ دفاع کی اجازت دیتا ہے مگر اس صورت میں بھی اعتداء سے بچنے کی نصیحت کرتا ہے تو ان حالات میں ہمارے لئے سوائے اس کے اور کیا صورت رہ جاتی ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے حضور دعا کریں اور اس سے کہیں اے ہمارے ہاتھوں کو روکنے والے اور اے ہماری زبانوں کو بند کرنے والے خدا! تُو آپ ہماری طرف سے اپنے ہاتھ اور اپنی زبان چلا۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ اُس کے ہاتھوں سے زیادہ طاقتور ہاتھ بھی دنیا میں کوئی ہے اور اُس کی زبان سے زیادہ مؤثر زبان بھی کوئی ہو سکتی ہے۔ تم نے خدا تعالیٰ کی قدرت کے کئی نظارے پچھلے دو سالوں میں دیکھے۔ اب تیسرا سال جارہا ہے اگر تم اس سال پہلے دو سالوں سے بھی زیادہ خدا تعالیٰ کی قدرت کے شاندار نظارے دیکھنا چاہتے ہو تو گزشتہ سالوں کے چالیس دنوں کے مقابلہ میں اِس سال سات ماہ تک مسلسل دعائیں کرو اور خصوصیت سے یہ دعا مانگتے رہو کہ **اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَ نَعُوْذُبِکَ مِنْ شُرُوْرِھِم** ۔ یعنی اے خدا! ہم دشمنوں کی گردنوں پر تیرے ہی ہتھیار چلانا چاہتے ہیں اور ان کے شرور اور فِتن سے تیری ہی حفاظت چاہتے ہیں۔ **نحر** اُس گڑھے کو کہتے ہیں جو اُس جگہ پر واقعہ ہو جہاں گردن اور سینہ باہم ملتے ہیں۔ یہیں سے بڑی رگیں سر کی طرف جاتیں اور دل سے دماغ کو خون پہنچاتی ہیں۔ سو **نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ** کے یہ معنے ہیں کہ اے خدا ان کا کُلّی طور پر استیصال کر دے اور شرارت اس طرح نہ مٹا کہ وہ بار بار زندہ ہوتی رہے بلکہ اس طرح مٹا کہ وہ کبھی ظاہر نہ ہو سکے۔ پھر احرار کے علاوہ ہمارے اندر بعض منافق بھی پائے جاتے ہیں جن کا وجود ہمارے لئے سخت

مضر ہے۔ گزشتہ دنوں گورنمنٹ کے بعض حکام کی طرف سے ہم پر جو مظالم ہوئے ہیں ان کی وجہ سے منافقوں نے بھی گردنیں اُٹھالی ہیں۔ منافق ایک حد تک ہی چل سکتا ہے زیادہ نہیں چل سکتا۔ پھر وہ ڈرپوک اور بُزدل ہوتا ہے، اُس کے سارے کام مخفی ہوتے ہیں اور بسااوقات ایسی صورت ہوتی ہے کہ شریعت اجازت نہیں دیتی کہ اُسے ننگا کیا جائے۔ پس اس کے شر سے بچنے کا ذریعہ بھی دعاؤں کے سِوا اور کوئی نہیں۔

پھر علاوہ ان واقعات کے جو ہمارے سامنے ہیں اُن عظیم الشان مقاصد کیلئے جن کو سرانجام دینے کیلئے سلسلہ احمدیہ قائم کیا گیا ہے اگر ہم خاص وقتوں میں دعائیں کریں تو یہ دعائیں ضرورت سے زیادہ نہیں بلکہ کم ہی رہیں گی۔ دنیا کا فتح کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ چاروں طرف لوگ ہمارے مخالف ہیں اور ہر جگہ ایسی روکیں پیدا کی جارہی ہیں جن کو دور کرنا انسانی طاقت سے بالا ہے اور جن مشکلات اور روکوں کو دور کرنے کیلئے **خداتعالیٰ کی نصرت کے سِوا اور کوئی ہمارے کام نہیں آسکتا۔ پس آؤ کہ ہم خداتعالیٰ** سے دعا کریں کہ وہ ان کاموں کے پورا کرنے میں ہماری امداد فرمائے جن کیلئے سلسلہ احمدیہ دنیا میں قائم ہؤا ہے۔ اور لوگوں کے قلوب کی اصلاح کرے بلکہ لوگوں کے قلوب کی اصلاح کا کیا ذکر ابھی ہمارے اپنے نفس ہی بہت بڑی اصلاح کے محتاج ہیں۔ پس خدا اپنے فضل سے ہمارے دلوں کی بھی اصلاح فرمائے، ہمیں اپنے نفس پر غالب آنے کی توفیق دے اور ہمیں وہ طاقتیں عطا فرمائے جن سے اس کے دین کا جلال ظاہر ہو اور اُس کا قُرب اور وصال ہمیں میسر ہو۔

غرض مت خیال کرو کہ یہ ایک رسمی بات ہے جو میں تمہارے سامنے پیش کررہا ہوں۔ یہ ایک نہایت ہی اہم مطالبہ ہے جس کو پورا کرنا جماعت کے ہر فرد کا فرض ہے۔ چاہئے کہ جماعتوں کے پریذیڈنٹ اور سیکرٹری اپنی اپنی جماعتوں کو یہ مطالبہ یاد دلاتے رہیں اور روزوں کے متعلق بھی یاددہانی کراتے رہیں۔ کیونکہ جو چیز بار بار سامنے آتی رہے اُس کی طرف دل متوجہ ہوجاتے ہیں اور کئی کمزور بھی جو پہلے حصہ لینے کیلئے تیار نہیں ہوتے حصہ لینے لگ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رسول کریم ﷺ کی اسی نکتہ کی طرف راہبری کرتے ہوئے فرماتا ہے فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى [۵] کہ تُو لوگوں کو نصیحت کرتا چلا جا کیونکہ نصیحت بہت دفعہ فائدہ دے جایا کرتی ہے۔

پس میں کہتا ہوں کہ اِن دنوں کو خاموشی سے مت گزارو بلکہ روزے رکھو اور دعائیں کرو اور

لوگوں سے کہو کہ وہ روزے رکھیں اور دعائیں کریں۔ جماعتوں کے پریذیڈنٹوں کو چاہئے کہ وہ مساجد میں بار بار لوگوں کو یاد دلاتے رہیں کہ ان ایام میں ان فِتنوں کے دور ہونے کیلئے دعائیں کی جائیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ان مقاصد کیلئے دعائیں کی جائیں جو سلسلہ احمدیہ کے قیام سے تعلق رکھتی ہیں۔اوران کمزوریوں کیلئے دعائیں کی جائیں جو خواہ ہم میں پائی جاتی ہیں یا دنیا کے اورافراد میں۔تا اللہ تعالیٰ کے فضل ایسے رنگ میں نازل ہوں کہ وہ مصائب کے پہاڑ جو دشمنوں کی طرف سے ہمارے راستہ میں گِرائے گئے ہیں پاش پاش ہو جائیں اور ہمیں کامیابی ،ترقی ،نیکی اور تقویٰ کے سامان زیادہ سے زیادہ عطا ہوں۔

پس دعا کے متعلق تمہاری کوشش اور ہمت دوسری کوششوں اور ہمتوں سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہونی چاہئے۔ کیونکہ یہ مطالبہ بھی دوسرے مطالبات سے کم نہیں بلکہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔پس روزوں کو یاد رکھواور دوسروں کو یاد دلاتے رہواور دعاؤں کو یاد رکھواور دوسروں کو دعاؤں کیلئے کہتے رہو کیونکہ کام بہت بڑا ہے اور مشکلات بہت زیادہ۔ہم کمزور اور بے بس ہیں۔ ہماری کمزوریاں ہم پر عیاں ہیں بلکہ ہم خود بھی اپنی کمزوریوں سے اتنے واقف نہیں جتنا ہمارا خدا۔پس ہم اُسی سے مدد طلب کرتے اور اُسی کی نصرت اور تائید اپنے ہر کام میں چاہتے ہیں۔

(الفضل ۲۴ر اپریل ۱۹۳۷ء)

---

۱ البقرۃ: ۱۸۷

۲

۳

۴ اِنَّ اِبۡرَاهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً...... (النحل:۱۲۱)

۵ الاعلیٰ: ۱۰